مسلمانوں کا نظامِ تعلیم

بختیار حسین صدیقی مرحوم ☆

حصولِ تعلیم انسان کا مذہبی فریضہ ہے' کیونکہ تعلیم اس کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ اور چونکہ زندگی کی اساس روحانی اور ابدی ہے اس لئے ابدیت کے نقطۂ نگاہ سے انسان کی ضروریات کو پورا کر کے وہ اس کے لئے ایک نظامِ کردار مرتب کرتی ہے جسے ثقافت کہتے ہیں۔ وہ ثقافت کی تشکیل ہی نہیں کرتی بلکہ نئی نسل میں اسے منتقل کر کے اس کا تحفظ بھی کرتی ہے۔

کسی قوم کی ثقافت زندگی کے متعلق اس کے مخصوص عقیدے یا تصور پر مبنی ہوتی ہے۔ یہ تصور ہی اس کی ثقافت کی روح رواں ہوتا ہے۔ اسلامی ثقافت کی بنیاد جس تصور پر استوار ہے وہ ہے توحید کا تصور جو اخلاقی اور روحانی قوت کو زندگی کا اصل محرک قرار دیتا ہے۔ توحید کا تصور کوئی بے جان مجرد تصور نہیں' بلکہ ایک ''زندہ قوت'' اور ٹھوس حقیقت ہے۔ یہ جب انسان کے ذہن میں اچھی طرح بیٹھ جائے اور اس کے دل میں اس طرح گھر کر لے کہ اس کی فکر' احساس اور ارادہ سب اس تصور کی تفسیر بن جائیں تو وہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن جاتا ہے۔ خیال یا تصور میں بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے تنظیم کا اصول فراہم کرتا ہے اور معاشرے میں خاطر خواہ تبدیلی لانے کے لئے مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ یہ توحید کے تصور ہی کی قوت تھی جس کی بدولت رسول اکرم ﷺ کی قیادت میں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوا جس میں مہاجر و انصار کی کوئی تمیز نہ تھی' غریب اور امیر کا کوئی فرق نہ تھا۔ زبان' رنگ' خون' وطن اور نسل کی کوئی تفریق نہ تھی' جس کی روحِ رواں صرف اور صرف اخوت' محبت اور رواداری یعنی آدمیت کے احترام کا جذبہ تھا۔ خیالات میں تبدیلی ہمیشہ معاشرتی نظام میں تبدیلی کا باعث بنتی ہے۔

توحید کا تصور اسلام کی تمام تعلیمات کی اساس ہے۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بنیادی تصور کا مکمل علم کس طرح حاصل کیا جائے کہ ہماری زندگی عملی طور پر اس تصور کی

☆ سابق پرنسپل قرآن کالج لاہور

تفسیر بن جائے۔ علم چونکہ عمل کی لازمی شرط ہے اس لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اسلام کے نظریۂ علم کی طرف رجوع کریں۔ قرآن نے حواس اور عقل کو علم کا ذریعہ قرار دیا ہے لیکن صرف ان کے بل بوتے پر توحید کا علم نہیں حاصل کیا جاسکتا۔ توحید کے علم کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی، جس کا ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ خدا صرف اپنے خاص بندوں کو وحی کے ذریعے توحید کا علم عطا کرتا ہے۔ ان خاص بندوں کو پیغمبر کہتے ہیں۔ صرف پیغمبروں ہی کو توحید کا صحیح اور مکمل علم ہوتا ہے۔ بقیہ انسانوں کا فرض ہے کہ وہ پیغمبر کی تعلیم پر بے چون و چرا ایمان لائیں اور پھر اس تعلیم کی روشنی میں عقل و فکر کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی کوشش کریں، جتنا کچھ علم وہ اپنی بساط کے مطابق حاصل کر سکتے ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ علم جزئی علم ہوگا اور کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اس میں درجات کا فرق بھی ہوگا، کیونکہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق ہی علم حاصل کر سکتا ہے۔ ایمان علمِ حق کی اوّلین شرط ہے۔ جس شخص کو پیغمبر کی تعلیم پر پختہ یقین ہے وہ اس یقین کی قوت کی بدولت اپنی عقل کے مطابق توحید کا جزئی علم حاصل کر سکتا ہے، ورنہ نہیں۔ ایمان پہلے، عقلی استدلال اور استنباط بعد میں۔ یہ ہے عقل کے ذریعے توحید کا علم حاصل کرنے کی لازمی شرط۔ صرف ''اہل یقین'' کے لئے، جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے: ''انفس'' میں خدا کی نشانیاں ہیں اور ''آفاق'' میں بھی''۔[1] انہی لوگوں کو قرآن نے توحید کا نقش اپنے دل پر ثبت کرنے کے لئے فطرت کا مشاہدہ کرنے اور اس پر غور و فکر کرنے کی بار بار تاکید کی ہے۔

اسلامی طریق تعلیم

توحید کی تلقین اور ''کتاب و حکمت'' کی تعلیم دینے کے لئے رسول اکرم ﷺ کو معلم بنا کر بھیجا گیا۔ معلم کی حیثیت سے آپ ﷺ کو وہ اصول اور طریقے بھی بتائے گئے جو تعلیم کو خوشگوار، مؤثر اور کامیاب بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ پہلی بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ مؤثر تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ جس قسم کے لوگوں کو تعلیم دینا مقصود ہو۔ اسی ماحول سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کو اُن کا معلم مقرر کیا جائے جو اُن کی افتادِ طبع، طور طریقوں اور خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ چنانچہ:

---

(۱) سورۃ الذاریات میں ارشاد ہوا: ﴿وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۞ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۞﴾ (آیات ۲۰، ۲۱) جبکہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ﴾ (آیت ۵۳)

﴿هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعة:۲)

''وہی ہے (اللہ) جس نے اُمیوں میں انہی میں کا ایک رسول بنا کر بھیجا' تا کہ وہ انہیں اللہ تعالیٰ کی آیتیں سنائے' ان کا تزکیہ کرے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے''۔

اور جب لوگوں نے خیر البشر ﷺ سے پوچھا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے تو حکم ہوا کہ:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ (الاسراء:۹۵)

''آپ فرما دیجئے کہ اگر زمین پر فرشتے ہوتے کہ اس میں چلتے اور بستے تو البتہ ہم ان پر آسمانوں سے کسی فرشتے کو رسول بنا کر بھیجتے''۔

دوسری بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ کسی کو زبردستی تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ استاد کا فرض ہے کہ پہلے وہ علم کی صحیح پیاس اور خواہش پیدا کرے اور پھر تعلیم دے۔ تعلیم کی بنیاد انسان کی اپنی خود متحرکی پر ہے۔ استاد اس خود متحرکی کو تقویت پہنچا سکتا ہے لیکن کسی شخص میں اگر یہ مطلقاً موجود ہی نہ ہو تو وہ اسے زبردستی اُس میں پیدا نہیں کر سکتا۔ قرآن کا ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّیْ عَمَلِیْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِیْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا یَعْقِلُوْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ یَّنْظُرُ اِلَیْكَ ۚ اَفَاَنْتَ تَهْدِی الْعُمْیَ وَلَوْ كَانُوْا لَا یُبْصِرُوْنَ ۝﴾ (یونس:۴۱-۴۳)

''اور اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو فرما دیجئے کہ میرے لئے میرے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال۔ جو عمل میں کرتا ہوں اس کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے اور جو عمل تم کرتے ہوئے اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف ظاہر میں آپ کی طرف کان لگا کر بیٹھتے ہیں' کیا آپ بہروں کو سنا کر اُن کے ماننے کا انتظار کرتے ہیں' گو اُن کو سمجھ بھی نہ ہو۔ اور اسی طرح ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو صرف ظاہری طور پر آپ کو (مع معجزات اور کمالات) دیکھ رہے ہیں۔ پھر کیا آپ اندھوں کو راستہ دکھانا چاہتے ہیں' گو اُن میں بصیرت نہ ہو''۔

جس شخص کے دل میں علم کی لگن اور طلب نہ ہو' جسمانی طور پر تو وہ معلم کے سامنے بیٹھا ہو لیکن ذہنی طور پر اس کی دلچسپیوں کا مرکز کہیں اور ہو اُسے تعلیم دینے سے کچھ فائدہ نہیں۔

تیسری بات آپ ﷺ کو یہ بتائی گئی کہ تعلیم دراصل ابلاغ کا نام ہے اور ابلاغ کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو۔ ہر قوم کا اپنا اسلوبِ بیان ہوتا ہے جو اُس کی زبان کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ ابلاغ کی جو آسانیاں اور سہولتیں مادری زبان میں ہوتی ہیں کوئی دوسری زبان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ زبان خیال کی ترجمان ہوتی ہے۔ مادری زبان ترجمانی کا یہ حق بہ طریق احسن ادا کرتی ہے' اس لئے سننے والے کو بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اسلوب بیان اتنا واضح اور مانوس ہوتا ہے کہ بات دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا گیا جو اپنی قوم کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ ان کی زبان میں انہیں توحید کی تعلیم دے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ﴾ (ابراھیم: ٤)

''ہم نے ہر قوم میں ایسا پیغمبر بھیجا جو ان کی زبان بولتا تھا تاکہ وہ (حق کی بات ان کی زبان میں) ان کے سامنے بیان کر دے''۔

پہلی بات کا تعلق معلم کے انتخاب سے ہے' دوسری کا متعلم کے انتخاب سے اور تیسری کا تعلیم دینے کے لئے زبان کے انتخاب سے۔ اس کے بعد طریق تعلیم اختیار کرنے کی باری آتی ہے کہ توحید کی تعلیم کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ قرآن نے اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب دیا ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (النحل: ١٢٥)

''بلایئے اپنے رب کی راہ پر حکمت اور عمدہ طریقے سے نصیحت کے ذریعے اور ان سے بحث کیجئے بہترین طریقے سے''۔

اس آیت میں تدریس کے تین بنیادی اصول بتائے گئے ہیں' حکمت' نصیحت اور بحث۔ قرآن چونکہ سرچشمۂ حکمت ہے' اس لئے معلم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس کے حکیمانہ نکات پر گہری نظر رکھتا ہو تاکہ وہ اس کے احکام کی حکمت کو اچھی طرح لوگوں کے دلوں میں بٹھا سکے اور ذہنی طور پر انہیں مطمئن کر سکے۔ قرآن نے تدریس کے اس اصول کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ﴾ (البقرة: ٢٦٩)

''جسے حکمت دی گئی اسے تو خیر کثیر دے دی گئی''۔

حکمت کی اسی اہمیت کی بنا پر اُموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں یونانی فلسفہ عربی زبان میں منتقل ہوا اور بعد ازاں علم کلام کی شکل میں اسلامی نصاب کا جزو بن گیا۔ غور وفکر کے ساتھ ساتھ فطری وجدان کی نشوونما کے لئے تصوف نے بھی اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں جگہ پائی۔

تدریس کا دوسرا بنیادی اصول عمدہ طریقے سے نصیحت کرنا ہے۔ جس طرح پہلا اصول تعلیمی عمل میں فلسفے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے اسی طرح دوسرا اصول نفسیات کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ کسی شخص کو جب اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر نصیحت کی جائے تو ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس کی دل آزاری نہ ہو' وہ اس میں اپنی ذلت محسوس نہ کرے' ورنہ وہ انہیں دور کرنے کے لئے کبھی اقدام نہیں کرے گا۔ تعلیم کا مقصود متعلم کی خود متحرکی کو تقویت پہنچانا ہے' جو نرمی' شفقت اور ہمدردی کے رویئے کا متقاضی ہے۔ سختی اور درشتی کا انسان پر الٹا اثر پڑتا ہے۔ اپنی غلطی پر نادم ہونے کے بجائے وہ اس پر اور دلیر ہو جاتا ہے' ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے۔ اسی نفسیاتی ردِعمل کے پیش نظر جب حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو فرعون کی تنبیہ کے لئے بھیجا گیا تو انہیں واضح طور پر ہدایت کی گئی کہ:

﴿ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴾ (طٰہٰ: ٤٤)

''اس سے نرمی سے بات کرنا' شاید وہ (برضا ورغبت) نصیحت قبول کرلے یا (عذاب الٰہی سے) ڈر جائے''۔

تدریس کا تیسرا بنیادی اصول بحث وجرح ہے۔ حکمت اور نصیحت سے کام نہ چلے تو پھر معلم کو چاہئے کہ وہ بحث کی طرف رجوع کرے۔ لیکن اس بات کا لحاظ رکھے کہ طریق بحث استدلال اور کلام دونوں اعتبار سے بہترین اور معیاری ہو۔ بحث عقلی دلائل پر مبنی ہو اور دلائل اتنے قوی اور مستحکم ہوں کہ مخاطب کو انہیں قبول کرتے ہی بنے۔ بحث کی ابتدا چونکہ سوال سے ہوتی ہے' اس لئے قرآن نے سوال کرنے کی بالخصوص تاکید کی ہے:

﴿فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (الانبیاء:٧)

''اگر تم کوئی بات نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لو''۔

علم ایک خزانہ ہے اور اس خزانے کی کنجی سوال ہے۔ بحث کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ کو واضح اور متعین مفہوم میں استعمال کیا جائے۔ خیالات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہوں اور دلائل تضاد سے پاک ہوں۔ اس ضرورت کے پیش نظر اُموی اور عباسی دَور میں یونانی منطق عربی زبان میں منتقل ہوئی اور اسلامی نصاب کا ایک حصہ بن گئی۔

اسلام نے صرف استخراجی طریقے کو تعلیم کا ذریعہ نہیں بنایا' تحلیل و تجزیے کے استقرائی طریقے کو بھی اس نے اتنی ہی اہمیت دی ہے جتنی کہ استخراجی طریق فکر و استدلال کو۔ جہاں اس نے بحث و جرح پر زور دیا ہے (جس میں استخراجی طریق استعمال ہوتا ہے) وہاں مظاہر قدرت کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کی بھی بار بار تاکید کی ہے۔ قدرت کی بنائی ہوئی نباتات' جمادات' حیوانات' معدنیات وغیرہ کے تجزیے سے ان کی ساخت' وظائف اور خواص کا جو علم حاصل ہوتا ہے اس سے بھی توحید کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ بصارت جب بصیرت کے ساتھ اس طرح متحد ہو جائے تو انفس اور آفاق میں ہر جگہ اللہ کی نشانیاں نظر آتی ہیں۔

﴿... وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۞ وَهُوَ الَّذِيْ مَدَّ الْاَرْضَ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْهٰرًا ۭ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيْهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۞﴾ (الرعد:۲'۳)

''(اور اُس نے) سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا' ہر ایک ایک وقت معین تک چلتا رہتا ہے۔ وہ تدبیر کرتا ہے اُمر کی' ظاہر کرتا ہے نشانیاں تاکہ تم اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین کرو۔ وہی تو ہے جس نے زمین کو پھیلا دیا اور اس میں پہاڑ اور نہریں پیدا کیں' اور اس میں ہر قسم کے پھلوں سے دو دو قسم کے پھل پیدا کئے' وہ رات کی تاریکی سے دن کو چھپا دیتا ہے۔ ان امور میں سوچنے والوں کے لئے (اللہ کی) نشانیاں موجود ہیں''۔

اسلام کی رو سے تعلیم انسان کی روحانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے۔ لیکن انسان صرف روح نہیں ہے' وہ جسم کے قالب میں ایک روح ہے اور جسم کا تعلق اس فانی دنیا سے ہے۔ جسم روح کے لئے ایک آلے کی حیثیت رکھتا ہے۔ آلہ استعمال کرنے والے کا کمال چونکہ آلے کے خود اپنے کمال پر بھی بڑی حد تک منحصر ہوتا ہے اس لئے روح کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ جسم کی ضرورتوں کا پورا کرنا بھی تعلیم کا فرض ہے۔ قرآن کا حکم ہے:

﴿وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷)

''دنیا سے اپنا حصہ لینا مت بھولو''۔

اور قرآن حکیم میں وارد یہ دعا کس قدر جامع ہے:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۞﴾

(البقرۃ:۲۰۱)

''اے ہمارے ربّ! ہمیں دُنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی عطا فرما' اور ہمیں آگ کے عذاب سے محفوظ رکھ!''۔

سورۃ البقرۃ میں علم کے ساتھ ساتھ جسمانی وجاہت اور قوت کو بھی مال و دولت پر برتری کی وجہ بتایا گیا ہے۔ حضرت طالوت کا ذکر ہے:

﴿وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ﴾ (البقرۃ:۲۴۷)

''اور اللہ تعالیٰ نے علم اور جسم کے سلسلے میں اسے زیادہ کشادگی دی''۔

پس تعلیم کا مقصد روح اور جسم دونوں کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ روح کی ضروریات کو پورا کرنے کا قرآن نے مفصل اور جامع طریقہ بتایا ہے' لیکن جسم کی ضروریات کو پورا کرنا اس نے انسان کی اپنی عقل وفکر پر چھوڑ دیا ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم' فنی تعلیم وغیرہ کا نظام معاشرتی ضروریات کے اعتبار سے اسے خود مرتب کرنا ہے۔ البتہ فنی تعلیم کی اہمیت کا قرآن نے جگہ جگہ ذکر کیا ہے۔ مثلاً:

﴿وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (الحدید:۲۵)

''اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں بڑی طاقت اور لوگوں کے لئے (بہت سے) فائدے ہیں۔''

حضرت داؤد علیہ السلام کے بیان میں لوہے میں نرمی اور لچک پیدا کرنے کا بالخصوص ذکر کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ﴾ (سبا:۱۰)

''اور ہم نے اس کے واسطے لوہے کو نرم کیا۔''

ہر نصاب تعلیم میں کتاب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور لیکچر بنیادی طریق تدریس ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کو ''کتاب'' کی تعلیم دینے کے لئے ''معلم'' بنا کر بھیجا گیا۔ جیسے جیسے آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی آپ اس کے احکام کی حکمت کو نصیحت اور بحث کے پیرائے میں تلقین کرتے رہتے تھے۔ قرآن پر کفار کا اعتراض اور اس کا جواب یوں مذکور ہے:

﴿وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا﴾ (الفرقان:۳۲)

''کفار نے کہا پیغمبر پر قرآن پورا کا پورا ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ اس لئے کہ ہم اس کے ذریعے سے آپؐ کے دل کو مضبوط کریں اور ہم نے اس کو پڑھ

سنایا ہے ٹھہر ٹھہر کر''۔

دل کو مضبوط کرنے سے مراد اسلام کی تعلیمات کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا ہے اور یہ مقصد ''ٹھہر ٹھہر کر'' وقفہ دے کر پڑھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے' نہ کہ بغیر توقف کے لگا تار پڑھنے سے۔ بغیر وقفے کے پڑھنے سے ذہن تھک جاتا ہے اور حافظے پر اس کا منفی اثر پڑتا ہے۔ وقفہ دے کر پڑھنے سے ذہن تازہ دم رہتا ہے۔ سمجھنے' یاد کرنے اور یاد رکھنے کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ اس نفسیاتی نکتے کو ایک اور آیت میں اس طرح بیان کیا ہے:

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾

(الاسراء:۱۰۶)

''ہم نے قرآن کو اس لئے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نازل کیا کہ تو آہستہ آہستہ اسے لوگوں کو پڑھ کر سنائے اور ہم نے اس کو بتدریج نازل کیا''۔

اس سے تدریس کا یہ اصول مرتب ہوا کہ اگر سبق چھوٹا ہو تو پورا سبق ایک ہی بار پڑھا دیا جائے' ورنہ سبق کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر لیا جائے اور انہیں بتدریج پڑھایا جائے تاکہ توجہ دینے اور یاد کرنے میں آسانی رہے۔ مضمون کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے اگلا حصہ پڑھاتے وقت پچھلے حصے سے اس کا تعلق ضرور بتایا جائے۔

''تدریج'' کے اصول کا اطلاق جس طرح کتاب کے مطالعے اور اس کے درس پر ہوتا ہے اسی طرح کردار کی اصلاح اور سیرت کی تعمیر پر بھی ہوتا ہے جو اسلام کی رو سے تعلیم کا اصل مقصود ہے۔ عادت طبیعت ثانیہ ہوتی ہے' اسے یک دم بدلا نہیں جا سکتا' البتہ رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جا سکتی ہے۔ کسی بری عادت کو چھوڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے آپ کو ذہنی طور پر اس کے لئے آمادہ کیا جائے۔ عزم میں جب پختگی آ جائے تو جزوی طور پر اس پر عمل شروع کر دیا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ عزم کی قوت بڑھے گی اور مذموم عادت کی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی۔ اس عمل کا بالآخر یہ نتیجہ نکلے گا کہ وہ عادت ہمیشہ کے لئے چھوٹ جائے گی۔ یہ ہے کسی عادت کے چھوڑنے کا نفسیاتی قانون جس کے مطابق قرآن نے ''بتدریج'' شراب نوشی چھوڑنے کی تلقین کی ہے۔ پہلے مرحلے میں صرف اس بات پر زور دیا گیا کہ شراب نوشی کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی' لیکن اس کے نقصانات فائدوں سے زیادہ ہیں:

﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ﴾ (البقرۃ:۲۱۹)

''لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے متعلق پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں' البتہ ان میں لوگوں کے لئے (کچھ) فائدے بھی ہیں' لیکن فائدے کے مقابلے میں گناہ کا پلہ بھاری ہے''۔

اس آیت میں شراب کو ایک دم ممنوع نہیں قرار دیا گیا۔ ذہنی طور پر لوگوں کو شراب نوشی چھوڑنے پر آمادہ کرنے کے لئے صرف یہ کہا گیا ہے کہ اس میں گناہ زیادہ ہے اور فائدہ کم۔ جب شراب کے گناہ ہونے کا عقیدہ لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو گیا تو حکم ہوا کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء:٤٣)

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ' یہاں تک کہ تمہیں اتنا ہوش آ جائے کہ جو کچھ تم زبان سے کہتے ہو اُس کا تمہیں علم ہو''۔

اس جزوی پابندی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ عادت کی گرفت ڈھیلی پڑی اور ارادے کی قوت بڑھی تو شراب کو مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا۔

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝﴾ (المائدة:٩٠)

''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بُت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں' سو ان سے الگ ہو جاؤ تا کہ تم فلاح پاؤ''

علم کی کوئی حد نہیں ہے۔ ہر عالم کے اوپر ایک عالم ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۝﴾ (یوسف:٧٦)

''اور ہر جاننے والے سے اوپر ہے ایک جاننے والا''

اس لئے کسی ایک عالم سے پڑھ کر تحصیل علم کا شوق پورا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جہاں کہیں بھی کوئی عالم ملے اس سے فیض اٹھایا جائے خواہ اس کی خاطر دُور دراز کا سفر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ معلوم ہوا کہ خضر علیہ السلام کو اُن باتوں کا علم ہے جو انہیں معلوم نہیں تو وہ ان کی تلاش میں نکل پڑے۔ جس جذبے کے ساتھ وہ اس سفر پر نکلے تھے قرآن نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَاۤ اَبْرَحُ حَتّٰۤى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۝﴾ (الكهف:٦٠)

(باقی صفحہ 58 پر)